



ساتھ زبانون کے ساتھ کہنا سیکھ
فرانسیس کے مافیہ کلا داسینا گرو
مٹو پاسا کے زبانی
ایکے غور سے کہنا ہے اُسے کا آئینہ ٹوٹ گیا تھا
ترجمہ © شب، م، جمیل
فرانسیس * پہلے کہنا

چاہ

فیصلے مجھے اپنی حوصلی آنے کا پیغام بھیجا اور مصدقہ کی کہ بیماری کے باعث وہ خود میرے دفتر نہیں آسکتی۔ میں اُس سے ملنے چلا گیا۔ چند رسمی جملوں کے بعد دولت مند بیوہ نے مجھ سے کہا کہ وکیل صاحب! میں ایک بہت اہم اور تازہ کفے ڈی آپ کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس کام کے لیے بڑی پھان بین کے بعد آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اب میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ میں جو کام آپ کے سپرد کرنا چاہتی ہوں وہ آپ کو میری موت کے بعد شروع کرنا ہے۔ سامنے میز پر میرا آخری وصیت نامہ دکھائے ساتھ ہی دس ہزار فرانک کے نوٹ بھی ہیں۔ اگر آپ اپنے کام میں ناکام ہے تو دس ہزار فرانک

کھانے کے بعد دعوت میں آئے ہوئے مرد تمہا کو نوشی کے لیے لگ کرے میں جمع ہو گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ باتوں باتوں میں غیر متوقع اور حیرت انگیز وراثت کا ذکر ہو گیا۔ اس دوران مشرقی مٹو نے ایک دل چسپ واقعہ سنایا۔ مشرقی شہر کے مشہور وکیلوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے کہا: آج کل میں ایک ایسے وارث کی تلاش میں ہوں جو انہماکی تلف وہ حالات میں غائب ہوا تھا۔ ویسے تو یہ دنیا میں پیش آنے والا ایک عام سا واقعہ ہے لیکن اس کی تفصیلات میرے لیے بہت اندوہ ناک ثابت ہوئیں۔
تقریباً چھ ماہ قبل ایک دولت مند بیوہ نے قاصد کے

۵ اگست ۱۸۵۰ء پیدائش فرانس کے نارمن اور ایسترافیہ خانوادے سے تعلق والے والدین کے ازدواجی معاملات پیش تر کشیدہ اور آہستہ آہستہ کی تلخیوں کا انجام، مستقل علیحدگی فرانس میں اُس وقت طلاق کا تصور نہیں تھا لیکن شوہر و بیوی کی رنجشیں کون سا قانون روک سکتا ہے علیحدگی کے وقت موپاسان کی عمر گیارہ سال تھی اور وہ شدت سے اپنی ماں کا طرف دار تھا۔ ساری زندگی اُس نے اپنی ماں کے سعادت مند بچے کے طور پر گزارا۔ گو باپ سے بھی ایک نرمی و شہنائی قائم تھا اور باپ کی حجاب سے گاہے گاہے مالی تعاون کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن باپ کے ذکر پر موپاسان کا سینہ غبارِ الود ہو جاتا تھا۔ آزاد خیال گھرانے سے فیست کے باوجود موپاسان کی ابتدائی تعلیم چرچ میں ہوئی۔ ۱۸۵۳ء سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے ایک خانقاہ میں بھیج دیا گیا مگر بچپن کی بے دست و پائی کا زمانہ گزرتے ہی موپاسان کو بے گلی ہوئے لگی۔ خانقاہی فطرت زندگی ایک رنج و گوشہ گیری کسی زندان کے مانند تھی۔ اُس نے دانیتہ ایسے حالات پیدا کیے، ایسی سرکشیاں کیں کہ ۱۸۵۸ء میں اسے خانقاہ سے نکال دیا گیا۔ یہاں سے وہ لی ماروے چلا گیا اور دوسرے سال یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کر لی۔ ۱۸۶۱ء کی خزان میں اُس نے پیرس میں حیا کے قانون کی تعلیم شروع کی۔ اُنھی دنوں فرانکو پروسین جنگ کی آفرانس میں قانون کی تعلیم ادھوریارہ گئی۔ فرانسیسی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ موپاسان نے بھی باقاعدہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابل سینے سپری کی اور باپ کی سفارش سے کوارٹر ماسٹر کے دھتے میں اُس کا تبادلہ ہو گیا۔ جولائی ۱۸۶۱ء میں جنگ سے واپسی پر قانون کی تعلیم از سر نو شروع کی اور باپ کی کوشش سے اسے انٹیلیجنٹ میں ملازمت مل گئی۔ وکالت کی تعلیم کی تکمیل تک یہ ملازمت اُس کی کھالت کرتی رہی۔ نوکر شاہی کے قواعد و ضوابط سے کوئی ذہنی مطابقت نہ تھی مگر اسے کتا باری ترقی ملی اور ۱۸۶۹ء میں ایک مرتبہ پھر ناپسندیدہ اور بے سوچ باپ نے بیٹے کی خواہش پر وزارتِ تعلیم میں اُس کا تبادلہ کروا دیا۔

موپاسان کی ماں مسز ڈیے ایک سرگرم ادب دوست نوجوان الفرڈ پوٹون کی بہن تھی۔ یہ نوجوان فرانس کے متاثرہ نازاد پیا مادام بوارے کے مصنف فلاپیر کا گھرا دوست تھا۔ ۲۲ سال کی عمر میں پوٹون کی ناگہان موت کے باوجود فلاپیر سے خاندانی رسم و رواج ختم نہیں ہوئی۔ موپاسان کے بعض سوانح نگاروں کا گمان یا ہڈیاں ہے کہ وہ فلاپیر کی ناجائز اولاد تھا۔ اس بک گمانی یا حقیقت بیانی کا مقبول ثبوت کوئی بھی پیش نہ کر سکا۔

نورسے ۱۸۶۴ء میں اپنے مستورہ ساگمضطرب بیٹے موپاسان کو فلاپیر کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیجا تھا کہ فلاپیر اپنے علم و فضل سے موپاسان کو مزین کرے۔ یہ فلاپیر ایسے صاحبِ کمال کی نگہ بان کا فیضان تھا کہ موپاسان کو فکرم کی حیا و گری، قلم کی حکمت رانی کا عرفان ہوا۔ فلاپیر نے اسے شکیبائی مسکتوں سے دوچار کیا۔ جب بھی فلاپیر پیرس آتا، تعطیل کے روز موپاسان کو طلب کرتا اور درس و تکریم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مسودوں کی اصلاح، نو بہتوں و مایوسی تحریروں کا کام، مشہور ہونے تک ایک مرتبہ فلاپیر نے پیرس کی ایک معتبر فری فروش خانوں کا خاکہ لکھنے کا کام موپاسان کے سپرد کیا۔ ایک بار دو بار تین بار... فلاپیر مسودے رد کرتا۔ موپاسان ایک مہم جو تھا۔ فلاپیر کے اطمینان تک اسے پسند نہیں آتی! مجز پستیاں تبت ختم پیرایوں کی تلاش اور تلاش خراش کرتا رہا۔ فلاپیر کے توسط سے فرانس کے بڑے قلم کاروں سے آشنائی کا موقع نصیب ہوا۔ ان میں ایمیل زولا، ایوان ترگوف، ایڈمنڈ گون کورٹ اور ہنری جیسن جیسے یاد گار زمانہ لوگ تھے۔ یہ سارے نام گرامی اتوار کی شام فلاپیر کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔ فلاپیر نے نہایت فخر سے انہیں باور کرایا تھا کہ موپاسان اُس کا عزیز ترین شاگرد ہے اور بیٹے کے مانند ہے۔ ۱۸۸۰ء میں شجر مثال فلاپیر کا وقت تمام ہو گیا۔ موپاسان کے لیے یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ اُس نے فلاپیر کی روشنی کی ہوئی آگ بجھنے نہیں دی اور اُس کے ذاتی و غیر ذاتی مشاغل پر جاری رہے۔ ملازمت اور کشتی رانی، سپر و مسیاحت، پری جیالوں کا تعاقب، دریا و سمندر سے اسے عشق تھا۔ دریا نے سین میں پچاس میل تک تنہا کشتی رانی کر لیتا تھا۔ نوکر شاہی سے بے رغبتی کے باوجود حکومت کی ملازمت کا عرصہ اُس کی زندگی کا سہولت اور تھا اُسے

”بیوہ نے اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ پہلے شخص ہیں جسے میں یہ باتیں بتا رہی ہوں تاکہ آپ کو میرے دکھ اور کرب کا احساس ہو جائے۔ آپ ایک ذہنی انسان معلوم ہوتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ مجھ پر نصیب انسانان سن کر آپ میرے بیٹے کی تلاش میں کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی کیونکہ اب ایسا نہ ہو، سب کچھ بتانے سے پہلے ہی میری ہمت جواب دے جائے“

”شادی سے پہلے میں ایک ہم عمر نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ میرا ارادہ اُس سے شادی کرنے کا تھا لیکن میرے والدین اس پر آمادہ نہیں تھے کیوں کہ میرا محبوب مال دار نہیں تھا۔ پھر میری شادی ایک امیر کبیر شخص سے کر دی گئی۔ میں نے

اپنی فیس سمجھ لیجیے گا اور اگر آپ کام یاب ہو گئے تو میری وصیت کے مطابق مزید ایک لاکھ فرانک آپ کو انعام کے طور پر ملیں گے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ مجھ سے کیا کام کہہ دانا چاہتی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ مجھے اُس کا گم شدہ بیٹا تلاش کرنا ہے جو اُس کی تمام ملکیت کا واحد وارث ہے۔ بیوہ نے یہ بات بھی دہرائی کہ مجھے اپنی تلاش کا آغاز اُس کی موت کے بعد کرنا ہے اور اُسے یقین ہے کہ بہت جلد اُس کا انتقال ہو جائے گا۔ اُس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سہارا دے کر اُسے بستر پر بٹھا دوں تاکہ وہ مجھے اپنی کہانی سنا سکے کہانی سن کر ہی میں اپنی تلاش کا کوئی لائحہ عمل مرتب کر سکوں گا۔ بیوہ واقعی بہت بیمار تھی، میں ڈاکٹر نہ ہونے کے باوجود اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ بس چند دنوں کی مہمان ہے“

- ❖ وہ ٹھوس حقیقت جو ماورائے رُوح ہے یعنی جسم اُسے صدیوں سے اپنا حق نہیں ملا۔ اسی لیے انسان بے کل ہے، دکھی ہے۔
- ❖ جب کوئی کسی ہم دمِ دیرینہ کو یاد کرتا ہے تو دراصل اپنے آپ کو یاد کرتا ہے۔
- ❖ طبیعت کی جولانی اگر زندہ و جاہلِ ابرو بہار اور سبزہ و گل ہی پر موقوف ہوتی تو کتنے ہیں کہ خود کو شادمان و شاد کا کہہ سکتے؟
- ❖ عورت کی ایڑی ہٹاؤ تو اُس کے نیچے سے کسی نہ کسی مرد کی ناک ضرور نکلے گی۔
- ❖ زمین میں ذرا سا سُورخ کرنا ہو تو پوری طاقت سے کُداں چلائی پڑتی ہے لیکن خاکِ بسرِ سج، کومل اکھوے اور زرمِ نازکِ پنیری کس دھیرج سے اسی زمین کو ایک ادا سے رضا مندر کے نکل آتے ہیں۔
- ❖ صُبح اُس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے، صُبح اُس وقت ہوتی ہے جب آدمی جاگ اُٹھے۔

الفلاح مسو سائنس سے کفیلہ اَحْمَد سالا در کی خوش بینی

میں ہمارے لیے عشق و عاشقی مناسب نہیں تھی مجھے شروع ہی میں خطرہ بھانپ لینا چاہیے تھا لیکن جذبات نے عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ میں فطری تقاضے سے مغلوب ہو گئی تھی نتیجہ ظاہر ہے، وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں ایک طرح سے اُس کی داغ بیل بن گئی تھی۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ اس میں تمام قصور میرا تھا مگر ایسا نہیں ہے۔ ہوا یہ تھا کہ میری محبت اور تنہائی نے میرے دوست کی حوصلہ افزائی کی، اُس کا اصرار بڑھتا گیا اور روز بہ روز شدت اختیار کرتا گیا۔ میں نے بہت مزاحمت کی لیکن حقیقت یہ ہے جناب کہ عورت کردار کی کتنی ہی مضبوط ہو، کسی مرد کے ساتھ تنہائی میں گھسٹوں رہنے سے کردار کی ساری مضبوطی خاک میں مل جاتی ہے اور وہ تو شادی سے پہلے میرا محبوب تھا۔

"اسی طرح چودہ سال گزر گئے۔ یہ چودہ سالہ دور میری زندگی کا خوش گوار ترین زمانہ تھا۔ اس دوران میرا لڑکا جوان ہو گیا۔ وہ اتنا ذہین اور فرماں بردار لڑکا تھا کہ کوئی بھی ماں اُس پر فخر کر سکتی تھی۔ میرا محبوب بھی اُسے بہت چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اُس کی پرورش کی تھی۔ اُس کی تعلیم و تربیت

کے لیے میرے محبوب نے سخت محنت کی تھی۔ میرا بیٹا انکل کہتا تھا، اُس سے بے حد محبت کرتا تھا اور اُس کے ملنے نہایت عزت سے پیش آتا تھا۔ وہ اُسے اپنا باپ، اپنا بھائی، اپنا نگران اور اپنا دوست سمجھتا تھا اور اپنے ہر معاملے میں اُس سے مشورہ لیتا تھا۔ اُس نے کبھی گھر میں انکل کی موجودگی پر اعتراض نہیں کیا تھا، اعتراض تو دُور کی بات ہے اُس نے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ انکل ایسی بے تکلفی سے ہمارے گھر کیوں آتے ہیں۔ اُس نے بچپن ہی سے میرے گھر کو اپنے اور اپنی ماں کے قریب دیکھا تھا اور اُسے ہمیشہ اپنے لیے مخلص و متفکر پایا تھا۔ وہ اپنے گھر میں انکل کا ملائی ہو چکا تھا اور اُسے اپنا اور اپنی ماں کا خیر خواہ تصور کرتا تھا۔

"پھر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میرا آشنا اپنی بیوی کے ساتھ ایک ماہ کی تعطیلات پر برطانیہ چلا گیا۔ یہ اُس کا معمول تھا۔ وہ ہر سال یا دوسرے سال چھٹیاں گزارنے باہر جاتا تھا۔ آخر برطانیہ سے لوٹ کر سب سے پہلے وہ مجھ سے ملنے آیا۔ ایک ماہ کی جدائی نے ہمیں بے قرار کر دیا تھا۔ ہم ٹوٹ کر بیٹے ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ پھر وہ چلنے لگتی دیر بعد مجھے گرد و پیش کا خیال آیا تو میں چونک پڑی۔ مجھے کمرے میں اچانک کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے جلدی سے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے اپنے بیٹے ہنری کی تیزی سے پلٹ کر واپس چلتے دیکھا۔

"میرے سر پر جیسے آسمان گر پڑا، کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اُس میں سما جاتی یا میرے پر لگ جلتے لوہے کہیں اڑ کر ہمیشہ کے لیے رات کے اندھیرے میں گم ہو جاتی معلوم نہیں، میں کتنی دیر، چکیاں لے لے کر دوٹی رہی میرا دل پھٹ رہا تھا، سارا پنڈا آگ میں پھنک رہا تھا۔ میں اُس مچھلی کی طرح ترپ رہی تھی جسے پانی سے نکال کر نخل پر پھینک دیا گیا ہو۔ وکیل صاحب اُس وقت میری جو حالت تھی، وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ میرا محبوب بھی سناٹے میں تھا، وہ مجھ سے دُور بیٹھا رہا، اُس نے مجھ سے تسلی دی، نہ رونے سے منع کیا اور نہ میرے قریب آیا۔ آخر بہت دیر بعد اُس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا: میں ہنری کے پیچھے جا رہا ہوں۔ اُسے۔۔۔۔۔ اُسے بھلنے کی کوشش کرنا

اپنے آس پاس حشرات ارض کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ اگر یہ بے زبان بے وقعت کیڑے کوڑے پوری زمین کی ملکیت کا دعویٰ کریں تو بے جا نہ ہو گا کیوں کہ جمہوریت کا دور ہے، کیڑوں کو گنا کرتے ہیں، تو لا نہیں کرتے۔

زمین پر ایک انسان کی نسبت بیس کروڑ حشرات ارض ہیں اور یہ تناسب روز بروز بڑھ رہا ہے۔ یہ انکشاف ایک امریکی جریدے نے انسان اور پرندے نے کیا ہے۔ جریدے کا اندازہ ہے کہ کیڑے کوڑے دنیا بھر کی فصل کا ایک تہائی حصہ برباد کر دیتے ہیں۔ انسان قدیم زمانوں سے کیڑے مار دوائیں ایجاد کرنے کی تگ و دو میں ہے۔ سب سے پہلے گندھک اور سکھیا وغیرہ کا استعمال کیا گیا۔ لیکن اب تک جدید دور کی مسلک ترین دوا بھی اس مخلوق پر قابو نہیں پاسکی ہیں۔ حشرات ہر دوا کے خلاف اپنے اندر مدافعتی نظام وضع کر لیتے ہیں اور بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر کے جان داروں کا اسی فیصد حصہ کیڑوں کوڑوں پر مشتمل ہے۔ ماہرین اب تک آٹھ لاکھ پچاس ہزار قسموں کے کیڑے دریافت کر چکے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر برس کیڑوں کی دو سو نئی اقسام دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان اقسام میں سب سے زیادہ تعداد چیونٹیوں کی ہے۔ روئے زمین کے چھوٹے بڑے تمام جان داروں کے وزن کا پچیس فی صد وزن چیونٹیوں پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔ حیاتیات کے ماہرین کہتے ہیں، اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ دوبارہ ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ زمین پر کیڑوں کے قدرتی دشمن بھی پرورش پاسکیں۔

”خادمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بہت دنوں تک مجھ پر نیم بے ہوشی طاری رہی۔ میں نیم بے ہوشی میں کبھی چنچیں ملتی کبھی زار و قطار روتی اور کبھی اول فول بگنے لگتی۔“

”جب میرے حواس بحال ہوئے، اپنا محبوب مجھے اپنے قریب بیٹھا نظر آیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُس پر نظر پڑتے ہی میں نے نظریں پھیر لیں اور اُس سے اپنے بیٹے کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود اُسے ڈھونڈنے میں ناکام رہا ہے۔ میں نے نہائی غصے میں اُس سے کہا کہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور میرے بیٹے کو تلاش کرو۔ جب تک کام یاب نہیں ہو جاتے مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ چلا گیا۔“

ہیں۔۔۔ میں اُسے بتاؤں گا۔“

”وہ بھی چلا گیا۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ آنسوؤں کے سونے سوکھ گئے اور میں بُری طرح نڈھال ہو گئی تو تھک کے بستر پر گر گئی اور اپنے رُوسٹھے ہوئے بیٹے کا انتظار کرنے لگی۔ میرے اندر اور باہر بلا کا سکوت تھا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے اندیشے سر اُبھارنے لگے اور دل خوف سے کانپتا رہا۔ آتش دان میں کوئی لکڑی چھتی تو میری وحشت زدہ فکریں دوازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ ایک اُن جانی دہشت نے میرا دل کسی آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ مجھے یقین ہے کبھی کسی بدترین مجرم کو بھی ایسے کرب اور ایسی اذیت کا تجربہ نہیں ہوا ہو گا۔“

”آدھی رات گزرنے پر مجھے اپنے محبوب کی طرف سے اطلاع ملی کہ اب تک وہ ہنری کو تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے اُس نے دریافت کیا تھا کہ ہنری گھر واپس تو نہیں آگیا؟ میں نے جواب بھجوا دیا کہ ہنری واپس نہیں آیا ہے، تمہیں اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیے۔“

”میں تمام رات گری پر بیٹھی انتظار کرتی رہی کئی بار مجھے اپنے ذہنی توازن پر شک ہوا۔ کبھی میرا دل چاہتا کہ پڑے پھاڑ کر اتنی پھلانگیں لگاؤں، اتنی دوڑوں کہ اعصاب شل ہو جائیں کبھی یہ خواہش ہوتی کہ زمین پر لوٹ لگاؤں لیکن کوئی خواہش اس قدر طاقتور نہیں تھی کہ میرے بدن میں جنبش تک پیدا کر سکتی۔ ساری رات مجھے عجیب عجیب دوسروں نے گھیرے رکھا۔ بُرے بُرے خیالات طوفانی جھگڑوں کی طرح ذہن میں چکراتے رہے۔ اب کیا ہو گا؟ اگر اُن دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا تو میرے بیٹے کا رد عمل کیا ہو گا؟ اگر وہ واپس آگیا تو کیا میں اُس کا سامنا کر سکوں گی؟ کیا وہ واپس آئے گا؟ نہ آیا تو میرا کیا بنے گا؟ اتنی بڑی زندگی میں تنہا کیے گزاروں گی؟“

”علی الصباح میری خادمہ نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر اُسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کر دیا، پتہ نہیں وہ چلی گئی یا کھڑی رہی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ میرے قریب آئی۔ ڈاکٹر نے سرام کی بنیادی تشخیص کی اور مجھے بستر پر بٹا دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔“

”وکیل صاحب! وہ دن ہے اور آج کا دن۔ نہ میرا بیٹا لوٹا نہ محبوب۔ میں نے گزشتہ بیس سال میں ان دونوں میں سے کسی کی شکل نہیں دیکھی۔ بیس سال سے میں برابر ایک عذاب جھیل رہی ہوں۔ میرا ہر لمحہ انتظار میں گزرتا ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب میرا بیٹا واپس آجائے۔ آپ اس سزا کی شدت محسوس نہیں کر سکتے، اسے ایک ماں کا دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار، اُف۔ پھر تھوڑی دیر چُپ رہ کے وہ بولی۔ لیکن اب یہ انتظار ختم ہونے والا ہے، میرا وقت قریب آ گیا ہے، میں اب زندہ نہیں رہوں گی، میں نے موت کی آہٹ سُن لی ہے، موت اس گھر میں داخل ہو چکی ہے اور اب مجھے بھی جینے کی تمنا نہیں ہے۔ جو زندگی میں بیس برس سے گزار رہی ہوں، موت اس سے زیادہ بھیاں تک نہیں ہو سکتی۔“

”اور وہ۔۔۔۔۔ میرا محبوب۔ وہ گزشتہ بیس سال سے بلا ناغہ میرے در پر آ رہا ہے۔ وہ خادمہ کے ذریعے روزانہ مجھ سے ملاقات کی درخواست کرتا ہے۔ اس عرصے میں اُس نے مجھے لمبے چوڑے خطوط بھی لکھے، میرے ملازمین کی خوشامدیں بھی کیں، انھیں بڑی بڑی رشوتیں بھی پیش کیں کہ وہ کسی طرح اندر داخل ہو سکے اور محض چند لمحوں کے لیے میرے پاس آ سکے مگر میں نے کبھی اُسے ملاقات کی اجازت نہیں دی، ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں۔ کیوں کہ۔۔۔۔۔ کیوں کہ۔۔۔۔۔ نہ معلوم کیوں مجھے پکا یقین ہے کہ جس لمحے بھی وہ میری نظروں کے سامنے آیا، عین اُسی لمحے میرا بیٹا بھی واپس آ جائے گا اور ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لے گا۔ آہ، میرا بیٹا۔۔۔۔۔ خبر نہیں کہاں ہے وہ؟ زندہ بھی ہے یا مر گیا؟ نہ جانے کہاں چھپا ہوا ہے؟ یہیں اسی ملک میں ہے یا سمندر پار چلا گیا۔ کیا اُسے کبھی میرا خیال آتا ہوگا؟ اپنی ماں یاد آتی ہوگی اُسے؟ کیا خبر اولاد والدین کو اتنا کیوں ستاتی ہے، ایسی سخت سزا کیوں دیتی ہے؟ ہمارے اپنے بچے، اتنے بے رحم، اتنے سنگ دل کیوں بن جاتے ہیں؟“

”موت کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ماں نے دردناک آواز میں غلا گھولتے ہوئے اپنے بچے کو پکارا۔ میرے بچے! میرے بیٹے! تم اتنے ظالم تو نہیں تھے، تم تو ہمیشہ ہنستے ہنساتے رہتے تھے، تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ تم نے اپنی ماں کو کس قدر

سخت سزا دی ہے، اُسے زندہ ہی دفن کر دیا تم نے اپنی ماں کو جو تم سے اس قدر محبت کرتی ہے کہ تمہیں کبھی بخاری بھی جاتا تو تمہاری ماں اپنی نیندیں حرام کر کے رات رات تمہارے سرھانے بیٹھی رہتی تھی۔“

”دیکھو، یہ سب کچھ اُسے بتانا، ضرور بتانا۔ بیوہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ بتاؤ گے نا؟ وعدہ کرنا۔۔۔۔۔ اُس سے کہنا کہ میرے بچے! میری جان! اپنی ماں والی ماں پر ترس کھاؤ، اُس پر رحم کرو۔ زندگی نے اُس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ جس دن سے تم گئے تھے اُس دن سے تمہاری ماں ایک لاش ہو گئی تھی۔ اب وہ واقعی مر گئی، اب تو اپنی ماں کو معاف کر دو، ایک بار اُسے محبت سے یاد کر لو۔ تمہاری بیس برسوں کی جدائی میں اُس نے ہر لمحہ ہنسنے کا ذائقہ چکھاتھا اور تمہاری یاد میں خون کے آنسو بہاتے۔ اب ایک دفعہ اُس کی قبر پر جانا اور اُسے ماں کہہ کر پکارنا۔ وہ سمجھ جائے گی کہ تم نے اُسے معاف کر دیا ہے۔ بیوہ زلزلہ رونے لگی، روتے روتے اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں دم بخود ہو کے وہ اَلَم ناک تماشا دیکھتا رہا جس کا سفر انجام میرے سامنے آیا تھا۔ اُس نے ہاتھ سے مجھے جانے کا اشارہ کیا، میں کھڑا ہوا تو وہ ہچکیوں کے درمیان میری طرف دیکھ کر بغیر بولی، اُسے یہ ضرور بتا دینا کہ میں نے۔۔۔۔۔ میں نے کبھی اُس کی شکل تک نہیں دیکھی، اپنے محبوب کی تمہاری بڑی مہربانی ہوگی، اب مجھے مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دو، میں تمہیں چاہتی ہوں۔“

”میں باہر نکل آیا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے چند روز بعد اُس مال دار بیوہ کے انتقال کی خبر مل گئی، میں اُس کے جنازے میں شریک ہوا۔“

”پھر میں نے اپنے تمام ذرائع اور تعلقات کام میں لگا دیے، اُس کے بیٹے کو تلاش کرنے کی اندھا دھند کوشش کی، لیکن اب تک اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ آپ اُس کے بارے میں کچھ بھی سوچیں لیکن میں اُسے ایک مجرم بیٹے کے نام سے یاد کرتا ہوں۔“